رئیس احمد جعفری

حاصلِ مطالعہ

یہ مضمون مشہور مستشرق گبس کی کتاب "عربس ان ہسٹری" سے ماخوذ ہے اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب کے اصحابِ علم وفضل بھی جب مسلمانوں کی تاریخ پر قلم اٹھاتے ہیں تو واقعات کا غلط تجزیہ کرنے، غلط نتائج نکالنے اور غلط بیانی سے کام لینے میں جھجک نہیں محسوس کرتے۔

اسلام کا عہدِ فتوحات

ساتویں صدی عیسوی کے آغاز پر قریب ورسطِ مشرق دو عظیم و حریف سلطنتوں بازنطین اور ایران میں تقسیم تھا۔ اس سے پیشتر تین صدی کی تاریخ زیادہ تر انہی کے باہمی نزاعات و جنگ جدال کے واقعات پر مشتمل تھی۔ بازنطینی سلطنت جس کا عظیم الشان دارالحکومت قسطنطنیہ تھا، تمدن و مذہب کے اعتبار سے یونانی و مسیحی تھی اور انتظامی لحاظ سے بڑی حد تک رومن۔ اس کی طاقت خاص طور پر اناطولیہ کے پلیٹو پر مبنی تھی جو اس زمانہ میں کلیتہً ہیلنی تھا۔ اس کے جنوب میں شام اور مصر کے صوبے واقع تھے جہاں بازنطینی حاکمیت کو طرح طرح کے خطرات لاحق تھے۔ ایک کی آبادی آرامی (ARAMIC) تھی اور دوسرے کی قبطی (COPTIC) جو نسلی اور ایک حد تک تمدنی اعتبار سے یونانیوں سے مختلف تھی۔ بازنطینی اقتدار اور اس کے عاید کردہ ٹیکسوں کی گراں باری سے اس کی نفرت کا اظہار ان مخالفانہ (MONOPHYSITE) کلیساؤں سے ہوتا تھا جو سلطنت کے قدیم مذہب آرتھوڈکس کریڈ کے سخت خلاف تھے۔ فلسطین میں یہودی جو اگرچہ اکثریت میں تو نہیں تھے مگر آبادی کا اس وقت بھی ایک اہم عنصر تھے۔ بازنطینی جور و تعدی سے برگشتہ مسیحیوں سے بھی زیادہ نالاں تھے انہیں اپنے آقاؤں سے کوئی محبت نہ تھی۔

بعض اعتبار سے ایران کی ساسانی سلطنت بازنطینی سلطنت سے ایک عمومی مشابہت رکھتی تھی یہاں بھی سلطنت کا قلب ایران کا پلیٹو تھا جس کی آبادی ایک انڈو یورپین زبان بولتی تھی اور اس کے ماتحت عراق کا صوبہ تھا جو نسلاً سامی اور مذہباً بے تعلق تھا۔ ساسانی ایران کا تمدن ایشیائی تھا اور بہ حقیقت

میں اس مخالف ہیلینی ردِعمل کا مظہر تھا جو یا بیٹیوں کے منتشر ہونے کا سبب بنا تھا۔ سرکاری مذہب زرتشتیت تھا ساسانی سلطنت کا اندرونی تار و پود بازنطینی سلطنت سے بھی زیادہ کمزور تھا۔ جہاں اناطولیہ میں فوجی اغراض و مقاصد نے سلطنت کی ٹھوس اقتصادی و عسکری بنیادیں مہیا کی تھیں وہاں ایرانی سلطنت چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں ایک انقلاب سے عہدہ برآ ہو رہی تھی۔ جس میں قدیم جاگیردارانہ نظام ٹوٹ چکا تھا اور اس کی جگہ فوجی استبداد اور بھاڑے کی فوج نے لے لی تھی۔ مگر یہ نیا نظام بھی محفوظ نہ تھا۔ اور آبادی کی بے چینیوں نے متعدد مذہبی بدعتیں پیدا کر دی تھیں۔ جن کی وجہ سے سلطنت کا مذہبی اور نتیجۃً سیاسی اتحاد خطرہ میں تھا۔

۶۰۲ء اور ۶۲۸ء کے درمیان آخری ایرانی و بازنطینی لڑائیاں لڑی گئیں۔ جو بازنطینی فتح پر منتج ہوئیں مگر دونوں فریق اس درجہ بست حال اور کمزور ہو چکے تھے کہ ریگستان عرب سے خطرہ کا جو غیر متوقع سیلاب امنڈنے والا تھا اس کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔

حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد نوخیز مسلم سوسائٹی کو ایک قسم کے آئینی بحران کا سامنا ہوا۔ پیغمبرؐ نے اپنی جانشینی کے لئے کوئی ہدایت نہیں چھوڑی، نہ انہوں نے قبائلی مجلس کی طرح کوئی کونسل قائم کی جو عارضی نازک زمانہ میں اپنے اختیارات سے کام لیتی۔ رضائے الٰہی کے واحد شارح کی حیثیت سے ان کی حاکمیت کی مخصوص بے مثل نوعیت نے انہیں اپنا رفیق یا جانشین نامزد کرنے کی اجازت نہ دی ہوگی۔ بعد کی شیعہ روایت کہ پیغمبرؐ نے اپنے چچازاد بھائی علیؓ کو جنہوں نے آپکی صاحبزادی فاطمہؓ سے شادی کی تھی جانشین بنایا تھا یقیناً غلط فہمی پر مبنی ہے۔

اس قسم کی جانشینی کا تصوّر ہی عربوں کیلئے غیر مانوس تھا اور یہ ممکن تھا کہ اگر حضرت محمدؐ کے لڑکا بھی ہوتا تو واقعات کچھ مختلف نہ ہوتے۔ حضرت موسیٰؑ کا معاملہ اس کی تائید کرتا ہے۔ عربوں کی یہ روایت کہ شیخ ایک ہی خاندان سے چنا جائے موثر معلوم نہیں ہوتی۔ بہرحال کثرت ازدواج والی سوسائٹی میں ابوبکرؓ بحیثیت خسر اور علیؓ بحیثیت داماد کے دعاوی قوی نہیں ہو سکتے۔ عربوں کے سامنے صرف ایک مثال تھی جس سے وہ ہدایت حاصل کر سکتے تھے اور وہ تھی نئے قبائلی سردار کا انتخاب۔ چنانچہ انہوں نے قبیلہ خزرج میں سے اپنا سردار چننے کی کوشش کر کے یہ دکھا دیا کہ ان کا اسلام ابھی ناپختہ ہے۔

اس بحران کا مقابلہ تین آدمیوں کے عزم محکم نے کیا۔ ایک ابوبکرؓ، دوسرے عمرؓ اور تیسرے ابو عبیدہؓ۔ انہوں نے ایک قسم کے فوجی انقلاب کے ذریعہ ابوبکرؓ کو پیغمبرؐ کے جانشین کی حیثیت سے مقرر کر دیا۔ دوسرے دن سب مہاجرین اور انصار کے سامنے ایک طے شدہ چیز موجود تھی جسے انہوں نے چاروناچار قبول کر لیا ابوبکرؓ کو خلیفہ یا نائب رسول کا خطاب دیا گیا۔ ان کے انتخاب سے خلافت کے عظیم ادارہ کا افتتاح ہوتا ہے ان کے چننے والوں کو اس منصب کے فرائض اور نشوونما کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا تھا اور اس وقت انہوں نے اُن فرائض کے حدود متعین کرنے یا اختیارات کی حدبندی کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ان کے تقرر کی واحد شرط یہ تھی کہ وہ پیغمبرؐ کے ترکہ کو بجنسہٖ قائم و محفوظ رکھیں گے۔

ابوبکرؓ کی حاکمیت ابتدا ہی سے مختلف اہم اعتبارات سے قبائلی شیخ کی حاکمیت سے مختلف تھی۔ وہ نہ صرف ایک فرقہ کے بلکہ ایک ریاست کے سردار تھے۔ ان کے ہاتھ میں انتظامی اختیارات اور فوج تھی۔ اور چونکہ ان کے جانشین بننے کے بعد حالات سیاسی و فوجی اقدامات کے متقاضی تھے اس لئے انہوں نے سیاسی و فوجی حاکمیت بھی اختیار کی جو امتداد وقت کے ساتھ منصب خلافت کا ایک لازمی جزو بن گئی۔ دو سال بعد جب ابوبکرؓ کا انتقال ہوا تو عمرؓ بذریعہ نامزدگی ابوبکرؓ کے جانشین بنے۔

ان کے عہد کا پہلا کام فوجی اقدام کے ذریعے قبائل کی اس تحریک کا رد کرنا تھا جسے ردّا (ارتداد) کہتے ہیں۔ یہ لفظ جس کے معنی مذہب سے برگشتگی یا الحاد کے ہیں، اصل واقعات کی اہمیت کی غلط نمائی کرتا ہے اور بعد کے مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے مؤرخوں نے اختیار کیا ہے۔ فی الواقع قبائل نے ابوبکرؓ کی خلافت کو تسلیم کرنے سے اس وجہ سے انکار نہیں کیا تھا کہ وہ مسلمان ہونے کے بعد دورِ جاہلیت کو واپس جانا چاہتے تھے بلکہ بات صرف اتنی تھی کہ پیغمبرؐ کے اور ان کے مابین جو سیاسی معاہدہ تھا وہ ان کی وفات سے قدرتی طور پر ختم ہو گیا تھا۔ جو قبائل مدینہ سے بہت زیادہ قریب تھے وہ مسلمان بنا لئے گئے تھے اور ان کے مفادات اُمّہ سے اتنے گہرے طور پر مشترک تھے کہ ان کی علیحدہ تاریخ نہیں لکھی گئی۔ باقی کے معاملہ میں حضرت محمدؐ کی وفات نے ان کے مدینہ سے روابط خود بخود منقطع کر دیئے اور فریقین آزاد ہو گئے۔ جب ابوبکرؓ کا انتخاب ہوا تو انہوں نے اپنے آپ کو اس انتخاب کا پابند نہ سمجھا۔ انہوں نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا لہٰذا انہوں نے

خراج دینا اور روابط معاہدہ فی الفور ختم کر دیئے۔ ابوبکرؓ کو مدینہ کا اقتدار قائم کرنے کے لئے نئے معاہدے کرنے پڑے۔ قریبی قبائل نے تو ان معاہدوں کو قبول کیا لیکن دور افتادہ قبائل نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ابوبکرؓ کو مجبوراً ان قبائل کیخلاف تبدیلیٔ مذہب کے پیش خیمہ کے طور پر فوجی تسخیر کی کاروائی عمل میں لانی پڑی۔

ارتداد کی لڑائیاں جو تبدیلیٔ مذہب کی جنگوں کے طور پر شروع ہوئیں جنگ ہائے فتوحات بن کر بالآخر حدود عرب سے بھی بہت آگے نکل گئیں۔ یہ فتوحات ایک طرف خود عرب میں، دوسری طرف عراق، شام اور مصر کے ہمسایہ صوبوں میں ایک ساتھ اور ایک دوسرے سے وابستہ ہوئیں نہ کہ یکے بعد دیگرے عرب قبائل غالباً کبھی بھی مفتوح و مغلوب نہ ہوتے اگر شمال کی مفتوحات نے جزیرہ نما کے اندرونی اقتصادی مسائل کا دلکش حل پیش نہ کر دیا ہوتا۔ شمال کی ابتدائی مہمات کی غایت حصول مال تھی نہ کہ فتوحات حاصل کرنا اور بعد کی مہمات اس وقت شروع ہوئیں جب دشمن کی کمزوری ظاہر ہو گئی۔ شروع میں مدینہ کا کنٹرول کمزور اور حکمت عملی کی عمومی ہدایت کاری تک محدود تھا۔ اور چونکہ مواصلات اس وقت نہایت دشوار تھے اس لئے تمام تفصیلات اور اقدام عمل کا معاملہ فوجی کمانڈروں اور گورنروں کے ہاتھ میں رہتا تھا۔

عرب فتوحات کی ایک کلیدی شخصیت، خالد بن ولیدؓ کی ہے جو ابوبکرؓ کے چیف جنرل تھے۔ پیغمبرؐ کی وفات کے وقت جو حالات تھے انہیں بحال کرنے کے احکام کی تعمیل کرنے کے بعد انہوں نے فوجی تسخیر کے پروگرام کو اختیار کر کے اس بات کا فیصلہ خود کیا کہ انہیں آگے کیا کرنا چاہیئے۔ عرب فتوحات کا حقیقی آغاز جنگ موتہ (مشرقی نجد میں) ۶۳۳ء سے ہوتا ہے۔ اس فتح نے عربوں پر مدینہ کی حکومت کی قابلیت ثابت کر دی اور انہیں اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ اس کی اطاعت قبول کر لیں۔ اس کے بعد مرکز مدینہ سے دائرہ کی مختلف سمتوں میں فتوحات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

مدینہ اور شام کے درمیان بہت سے نیم مسیحی عرب قبائل رہتے تھے اور یہ ریگستان کی طرف سے پیش قدمی کے راستہ میں ایک قطعی مزاحمت تھے۔ تاریخی حوالوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں لیکن قیاس کہتا ہے کہ انہوں نے بھی ان فتوحات میں اہم حصہ لیا ہوگا اور ہرقل نے وہ امدادی رقم بند کر کے جو بازنطین کی حکومت انہیں

دیتی تھی انہیں حملہ آوروں کا حامی و مددگار بنا دیا ہوگا۔ ۶۳۳ء میں ابوبکرؓ نے شام کی مہم کے لئے رضاکار بھرتی کرنے کی اپیل کی اور کئی مستقل فوجیں فلسطین اور شام کو روانہ کیں۔ دوسرے سال عربوں نے بازنطین کی ایک چھوٹی سی فوج کو شکست دی اور فلسطین پر کئی چھوٹے چھوٹے حملے کئے مگر اس کے بعد پیچھے ہٹ کر مدینہ سے کمک آنے کا انتظار کرنے لگے اور ہرقل ان کے مقابلہ کے لئے ایک بڑی فوج تیار کرتا رہا۔ اس موقع پر خالد بن ولیدؓ دفعتاً عراق سے پامیرا کے راستہ سے فرات تک پہنچے اور اپریل ۶۳۴ء میں دمشق کے سامنے نمودار ہوئے۔ شہر کو لوٹنے کے بعد وہ واپس آ گئے اور جنوب کی دوسری فوج کے ساتھ مل گئے۔ اسی اثنا میں بازنطینی یروشلم کے قریب پہنچ گئے لیکن اجنادین کی لڑائی میں عربوں کی متحدہ فوج سے شکست کھائی۔ بازنطینیوں کی مزید پسپائیوں اور کمزوریوں اور شش ماہہ ناکہ بندی کے بعد عربوں نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ قبضہ کرنے کے بعد وہ فلسطین میں منتشر ہو گئے اور خالد شمال کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی دوران میں ہرقل نے ایک زبردست فوج تیار کی جو خاص طور پر آرمینیوں پر مشتمل تھی اور حمص کی امداد کے لئے ایک عرب رسالہ تھا جو باجگذار عرب قبائل سے بھرتی کیا گیا تھا۔ چونکہ دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لئے عرب دمشق سے واپس آ کر دریائے یرموک پر جمع ہو گئے اور یہاں انہوں نے بازنطینیوں کو ایسی شکستِ فاش دی کہ سارا شام و فلسطین ان کا تابع فرمان بن گیا۔ صرف دو قلعہ بند مورچے قیصریہ اور یروشلم باقی رہ گئے۔ شام کو فتح کرنے کے بعد خالد کو واپس بلا لیا گیا۔ اور ان کی جگہ ابوعبیدہ کو مقرر کیا گیا۔ جو جنرل کی بجائے ایک حاکم و منتظم تھے۔ ۶۳۶ء میں عمرؓ شام تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے حکومت کا ایک وسیع خاکہ مرتب کیا۔

عراق پر حملہ کرنے کی تجویز ابتداً سرحد پر رہنے والے قبائلی سرداروں کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ وہ جنوب میں عربوں سے اور شمال میں ایرانیوں سے گھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی نجات اسی میں دیکھی کہ اسلام قبول کر کے ایرانی علاقہ پر مشترکہ حملہ کریں۔ ۶۳۳ء میں خالدؓ نے حیرہ پر مقامی طور پر بھرتی کی ہوئی ایک چھوٹی سی فوج سے حملہ کیا۔ حملہ کی غیر متوقع کامیابی کی وجہ سے مزید کوششیں کی گئیں جو بالآخر "جنگِ پل" میں عربوں کی زبردست شکست پر ختم ہوئیں۔ اس لڑائی میں خود ایرانی شہنشاہ یزدگرد ایرانی فوجوں کا کمانڈر تھا۔ مگر عربوں نے جلد ہی اپنی قوت مجتمع کر کے نئے حملہ کی تیاری کی اور قادسیہ کی جنگ میں مٹھی بھر عربوں نے

۶۳۷۰۰۰ ایرانیوں کو شکستِ فاش دی۔ یہ جنگ فیصلہ کن تھی۔ اس کے بعد عربوں نے ایرانیوں کا تعاقب کیا اور ان کے پایۂ تخت مدائن پر قبضہ کر لیا اور سارے عراق کو مسخر کر کے تیزی کے ساتھ ایرانی فوج کو جلولہ کے مقام پر دوسری شکست دی۔ اس کے بعد عرب فوج عراق اور شام میں سے ہو کر میسوپوٹامیا میں مقابلہ کے لئے روانہ ہوئی اور فرٹائل کریسنٹ کی فتح مکمل کر لی۔

عرب تاریخ کے مطابق مصر پر حملہ خلیفہ کی مرضی کے خلاف ہوا۔ عمرو بن العاص کو شام کے ایک مقام پر عمرؓ کا پیغام پہنچا۔ کہ واپس آ جاؤ۔ مگر وہ واپس نہیں آئے بلکہ برابر آگے بڑھتے گئے۔ مصر کے حالات بھی شام عراق کی طرح سازگار تھے۔ قبطی یونانیوں کی حکومت سے سخت نالاں اور حملہ آوروں کی مدد کے لئے تیار تھے۔ ۱۲ دسمبر ۶۳۹ء کو عمرو مصر کے سرحدی شہر العریش پہنچے۔ ان کے ساتھ تین ہزار یمنی رسالہ تھا۔ اس پر انہوں نے آسانی سے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مزید فتوحات کی تشویق ہوئی۔ پلوشیم کو جسے اب فرامہ کہتے ہیں فتح کرنے کے بعد وہ موجودہ قاہرہ کے قریب بابیلون کے بازنطینی قلعہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی اثنا میں مدینہ سے پانچ ہزار کی کمک آ گئی جس کی وجہ سے جولائی ۶۴۰ء میں بازنطینیوں کو آسانی سے شکست دے دی گئی اور دوسرے سال شہر نے اپنے آپ کو عربوں کے حوالہ کر دیا اور مصر میں بازنطینیوں کے پاس صرف اسکندریہ باقی رہ گیا۔ اسکندریہ کا محاصرہ ایک سال تک جاری رہا اس کے بعد عمرؓ اور قبطی مقوقس کے درمیان معاہدہ ہوا جس کی رو سے شہر عربوں کے حوالے کر دیا گیا اور بازنطینی فوج واپس چلی گئی۔ ۶۴۵ء میں یونانیوں نے سمندر کے راستہ سے حملہ کر کے شہر کو فتح کرنے کی کوشش کی اور عارضی طور پر کامیابی بھی حاصل کی لیکن دوسرے سال شکست کھا کر واپس چلے گئے۔

ایک کہانی عام طور پر یہ مشہور ہے کہ اسکندریہ پر قبضہ ہونے کے بعد خلیفہ عمرؓ نے حکم دیا کہ شہر کی عظیم الشان لائبریری کو آگ لگا دی جائے اور وجہ یہ بیان کی کہ اگر اس کی کتابوں میں وہی باتیں ہیں جو قرآن میں موجود ہیں تو ان کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر وہ نہیں ہیں تو وہ ناپاک ہیں جب بھی ان کی ضرورت نہیں مگر تحقیقات جدیدہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ قصہ قطعی طور پر بے بنیاد ہے ابتدائی زمانہ کی کسی تاریخی کتاب میں حتیٰ کہ کسی عیسائی کتاب میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ کہانی سب سے پہلے تیرھویں

صدی میں بیان کی گئی ہے۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ سرافیم کی عظیم الشان لائبریری عربوں کی آمد سے بہت پہلے اندرونی لڑائی جھگڑوں میں برباد ہو چکی تھی۔

فرٹائل کریسینٹ کے شمال اور شمال مشرق کے غیر سامی پہاڑی علاقوں میں عربوں کی پیشقدمی سُست تر اور دشوار تر رہی۔ ایرانی پلیٹو پر سالہا سال تک مقاومت و مزاحمت کا سلسلہ جاری رہا اور خراسان معاویہ کے زمانہ تک "کلیتہً" فتح نہیں ہو سکا۔ اناطولیہ میں مشکلات اور بھی ناقابل عبور ثابت ہوئیں اور آج تک طارس (TAURUS) کی پہاڑیاں عربی زبان کی آخری شمالی جغرافیائی حدود ہیں۔

عربوں نے اپنی عظیم فوجی مہمات میں جو جنگی حکمتِ عملی اختیار کی اس کے تعین میں تمام تر ریگستانی طاقت کو دخل تھا بالکل اسی طرح جیسے آج کل کی استعماری طاقتیں بحری طاقت سے کام لیتی ہیں۔ عرب ریگستان سے واقف و مانوس تھے اور وہ اس میں ہر جگہ بہ آسانی پہنچ سکتے تھے مگر ان کے دشمن نہیں پہنچ سکتے تھے۔ وہ اسے ذریعہ مواصلات و فراہمی رسد و کمک کے لئے اور ہنگامی موقعوں پر پسپائی کے لئے استعمال کر سکتے تھے اور یہ کوئی حادثاتی بات نہیں ہے کہ عربوں نے اپنے ہر مفتوحہ صوبہ میں اپنے مستقران قصبوں میں قائم کئے جو ریگستان کے کنارے واقع تھے اور دمشق جیسے موجودہ شہروں کو اس وقت استعمال کیا جب انکی حالت اچھی ہو گئی۔ پھر انہوں نے حسب ضرورت عراق میں کوفہ اور بصرہ جیسے شہر قائم کئے اور مصر میں فسطاط اور تیونس میں قیروان آباد کئے۔ یہ فوجی مستقر ابتدائی عرب سلطنت کے جبرالٹر اور سنگاپور تھے۔

عربوں نے ان میں اپنی چھاؤنیاں اور فوجی بستیاں بسائیں۔ بنی اُمیّہ کے عہد تک یہ شہر عرب حکومت کے خاص مرکز بنے رہے۔ ان شہروں یا امصار نے مفتوحہ ممالک میں عرب اثرات کے استحکام میں بنیادی حصہ لیا ہے مجموعی طور پر تمام صوبوں میں عرب اقلیت میں تھے مگر ان امصار میں ان کی اکثریت تھی اور عربی ان کی خاص زبان۔ یہ آس پاس کے اضلاع کی زرعی پیداوار کے بازاروں کا کام دیتے تھے اور ان کے ذریعہ عربی زبان گرد و پیش کے مضافاتی علاقوں میں پھیلتی تھی۔ پھر جلد ہی ہر عرب فوجی شہر کے باہر دُور دُور تک دوکانداروں اور کاریگروں کے شہر آباد ہو گئے۔ یہ لوگ فوجی شہروں سے متعلق ہوتے تھے اور حکمران طبقہ کی ضروریات زندگی پوری کرتے تھے۔ مضافات سے آبادی کے اس انتقال کو غیر مسلم کاشتکاروں پر امتیازی

ٹیکس اور زرعی پیداوار کی غنیمتوں میں کمی سے بھی تحریک ہوئی جس کی وجہ یہ ہوگی کہ عرب فاتحین میں وسیع پیمانہ پر سرکاری آمدنی بصورت جنس تقسیم کی جاتی تھی۔

یہ عظیم فتوحات بنیادی طور پر اسلام کی توسیع نہ تھی بلکہ عرب قوم کی توسیع تھی اور اس کی وجہ جزیرہ نما کی کثرت آبادی کا دباؤ تھا جو ہمسایہ ممالک میں نکلنے کا راستہ چاہتی تھی۔ یہ اس سلسلۂ ہجرت کی ایک کڑی تھی جس میں سامی نسل کے لوگ وقتاً فوقتاً (FERTILE CRESCENT) اور اس کے آگے تک گئے۔ عربوں کی یہ توسیع اس طرح دفعتہً نہیں ہوئی جیسی کہ شروع میں بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ جس جس زمانہ میں عربوں کو ان کے جزیرہ نما میں محدود رکھنے والی روک مضبوط رہی اور وہ اسے توڑ کر نہیں نکل سکے تو کثرت آبادی کے دباؤ سے جزوی کمی عرب عناصر کے سرحدی علاقوں میں متواتر نفوذ سے ہوتی رہی۔ چنانچہ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں عربوں کے اہم نفوذ کی کافی شہادتیں ملتی ہیں۔ خصوصاً فرات کے علاقے فلسطین اور جنوبی مشرقی شام میں۔ یہ غزہ اور بصرہ کے دو بازنطینی شہروں ہی میں عربوں کی آبادی فتوحات سے پہلے بہت کافی تھی اور اس بات میں بہت کم شبہ کی گنجائش ہے۔ فاتح عرب جب قریب ترین مفتوحہ ممالک میں گئے تو وہاں انہیں اپنے بہت سے اعزاء و اقربا پہلے سے آباد ملے۔

ابتدائی دور کے مصنفوں (تاریخ نگاروں) نے فتوحات میں مذہب کا رنگ غالب دکھایا ہے اور کچھ جدید لکھنے والوں نے اس معاملہ میں تفریط سے کام لیا ہے مگر اس کی اہمیت صرف یہ ہے کہ اس سے اُن لوگوں میں جو اشتعال پذیر اور جذباتی تھے اور کسی قسم کے ضابطہ کی پابندیوں سے ناآشنا تھے ایک عارضی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوئی تھی اور چونکہ تحکم سے کام نہیں نکل سکتا تھا اس لئے ترغیب ذریعۂ کارگر آری بن گیا۔ اس چیز نے انہیں کچھ وقت کے لئے زیادہ خود اعتماد اور ضبط کا خوگر بنا دیا مذہبی نگ جنگ ہائے فتوحات میں عرب اتحاد و عرب فتح کی علامت تھی مگر یہ بات کہ فتوحات کی قوتِ محرکہ مذہبی کے بجائے دنیوی تھی خود اس دور کے بعض ایسے سربرآوردہ لوگوں کے عمل سے ظاہر ہے جن کی مذہب سے دلچسپی اس نوعیت کی نہ تھی۔ چند مستثنیات کے علاوہ عرب سلطنت کی تخلیق میں کٹر مسلمانوں اور اہل زہد و اتقا کا بہت ہی کم حصہ ہے۔

بعد کی صدیوں کے عرب مورخوں نے ہمارے سامنے نئی سلطنت کے نظم و نسق کے متعلق جو عمر تے

قائم کیا تھا بڑی تفصیل سے پیش کی ہیں اس نظم ونسق کی نوعیت کیا تھی اس کو تنقید جدید اور بالخصوص ان عصری انتظامی دستاویزات نے جو مصر میں اسلام کی پہلی صدی کے مخطوطات پیرس کی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں واضح کر دیا ہے۔

پہلے خلفاء نے اس معاملہ کے عملی تقاضوں کے مطابق کام کیا۔ انہوں نے خود شرائط و طاقت کی تعریف کرنے یا اصول وضع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی لہذا ان کی کارروائیوں کا مطالعہ سادہ واقعات سے کرنا چاہیئے۔ انکی پالیسی صرف مفتوحہ صوبوں کی رعایا کے سود و بہبود سے متعین نہیں ہوتی تھی بلکہ فتوحات نے جو ایک عرب مسلم فرقہ اشرافیہ پیدا کر دیا تھا، اس کے مفاد اثر انداز ہوتے تھے۔ اور بڑی حد تک کمانڈروں اور حکمرانوں کے طرز عمل سے بنتی تھی۔ ابتداء میں عربوں نے ایرانی اور بازنطینی انتظامی مشینری کو مع اس کے عمال کے قائم رکھا یہاں تک کہ سکے بھی انہی کے جاری رہے۔ لیکن ۲۰ھ کے بعد ہی عمرؓ نے نئے ضابطوں اور کارروائیوں کی ضرورت محسوس کر کے ایک نیا نظام قائم کیا جس کے ذریعہ ساری سلطنت مسلمانوں کی امانت بن گئی اور خلیفہ اس کا واحد امین ہو گیا۔ مختلف مفتوحہ صوبوں کے قانون و رواج مختلف تھے۔ جس وقت عربوں نے پرانے نظاموں کو اپنے ہاتھ میں لیا اس وقت سلطنت کا کوئی ایک اور ہم رنگ قانون نہ تھا۔ شام اور مصر میں اطاعت مشروط تھی۔ اور عمرؓ مقامی رواجات کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔ عراق میں جس نے اپنی مرضی سے اطاعت قبول کی تھی، اسے زیادہ آزادی عمل حاصل تھی۔

عربوں نے صرف سرکاری زمینوں پر اور ان لوگوں کی زمینوں پر قبضہ کیا جو نئی حکومت کے دشمن تھے۔ دوسرے زمیندار جنہوں نے اسے تسلیم کیا انہیں بعض ٹیکسوں کی ادائیگی کی شرط کے ساتھ اپنی زمینوں پر پورے پورے اختیارات دیدیئے گئے۔ ضبط شدہ زمینوں کی باقاعدہ رجسٹری کی گئی اور ان کا انتظام حکومت براہ راست خود کرتی تھی۔ مسلمانوں کو بیرون عرب زمینیں خریدنے کی اجازت تھی۔ ان میں سے بہت سوں کو سرکاری زمینیں قطیعہ، ایک قسم کے پٹے پر دی گئیں۔ یہ مراعات مزروعہ زمینوں یا بنجر زمینوں پر دی جاتی تھیں۔ اگر زمین بنجر ہوتی تھی تو حکومت ٹیکسوں میں تخفیف کر کے اور زر تقاوی وغیرہ دے کر مدد کرتی تھی۔ عمرؓ نے اپنے عہد میں اس قسم کی مراعات چند لوگوں کو دی تھیں۔

مگر اُن کے جانشینوں نے بہت سے لوگوں کو دیں۔ عرب سے باہر مسلمان زمیندار اراضی کا پورا مشخصہ ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کچھ جھگڑے کے بعد بہت کم دیتے تھے جسے عُشر یا دسواں حصہ کہا جاتا تھا مسلمانوں پر ایک قلیل مذہبی ٹیکس (زکواۃ) کے علاوہ باقی تمام ٹیکس غیر مسلم اہلِ رعیت ادا کرتے تھے۔ ان میں جزیہ اور خراج شامل تھے بعد کو ان دونوں میں امتیاز ہوگیا۔ اور ایک کو پول ٹیکس سمجھا جانے لگا جو غیر مسلموں پر عاید ہوتا تھا اور دوسرا اراضی ٹیکس۔ خلافت کے ابتدائی زمانہ میں یہ دونوں اصطلاحیں مرادف المعنی سمجھی جاتی تھیں اور ان سے وہ اجتماعی ٹیکس مراد لیا جاتا تھا جسے عرب مجموعی طور پر علاقہ پر عاید کرتے تھے۔ بازنطینی اور دوسرے حکام کو اختیار تھا کہ وہ اس کی تشخیص و تحصیل پرانے طریقہ پر کریں۔ فاتحین مفتوحین کے اندرونی سول اور مذہبی نظم و نسق میں کوئی دخل نہ دیتے تھے۔ مفتوحین ذمی کہے جاتے تھے یعنی ان مذاہب کے لوگ جن کی قرآن حفاظت کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

رعایا نے بازنطینی اقتدار کی جگہ عرب اقتدار کو عام طور پر خوش آمدید کہا کیونکہ اس کے جُوئے کا بار پرانے جُوئے سے کہیں زیادہ ہلکا تھا۔ ٹیکسوں کے لحاظ سے بھی اور دوسرے معاملات میں بھی۔ حتیٰ کہ شام و مصر کی مسیحی آبادیاں بھی قدیم بازنطینی حکومت کی جگہ اسلام کے اقتدار کو ترجیح دیتی تھیں۔

اسلام کے ابتدائی عہد کی ایک یہودی مذہبی تحریر میں فرشتہ کی زبان سے ایک ربّانی روشن ضمیر کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے:۔ "بن یحییٰ! خوف مت کرو، خالق پاک نے اسمٰعیل کی حکومت اس لئے قائم کی ہے کہ وہ تم کو اس شرارت (بازنطینیت) سے بچائے۔ وہ مقدس و مبارک ان کے لئے اپنی مرضی کے مطابق ایک پیغمبر کو مبعوث کرے گا۔ اور ان کے لئے ملک فتح کرے گا۔ اور وہ آئیں گے اور اسے بحال کریں گے......"

ہم اس کا مقابلہ مالیہ کے ایک شامی مسیحی مؤرخ کے ان الفاظ سے کر سکتے ہیں:۔ "لہٰذا منتقم حقیقی نے ہمیں رومیوں کے جبر سے عربوں کے ذریعہ نجات دلائی۔ رومیوں کی سفاکی اور ان کی نفرت سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہمیں کچھ تھوڑا فائدہ نہیں ہوا۔" مفتوحہ صوبوں کے لوگوں نے صرف نئی حکومت کے سامنے سر اطاعت خم کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ بعض صورتوں میں اس کے قیام و استحکام میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ فلسطین میں سامریوں نے عرب حملہ آوروں کو ایسی مؤثر امداد دی کہ کچھ عرصہ کے لئے انہیں بعض ٹیکسوں

سے مستثنیٰ کردیا گیا۔ اس کے علاوہ ابتدائی زمانہ کی تاریخوں سے مقامی یہودیوں اور مسیحیوں کی طرف سے عملی امداد کی اور بہت سی شہادتیں ملتی ہیں۔ خود عربوں کا اسلام اور عربیت کو ایک اور مرادف چیز سمجھنا، ان کے اس طرز عمل سے بخوبی ظاہر ہے جو وہ ان نومسلموں کے ساتھ روا رکھتے تھے جو مفتوحین میں سے اسلام کی طرف جوق در جوق آتے تھے۔ عربوں کے لئے غیر عرب مسلمانوں کا تصور کچھ ایسا غیر متوقع تھا کہ نئے مسلمان موالی یا کسی عرب قبیلہ کی رعایا بن کر ہی دین میں شامل ہوسکتے تھے اگرچہ نظری طور پر موالی عربوں کے ہم پلّہ اور بہت سے ٹیکسوں سے آزاد ہوتے تھے۔ لیکن عرب ان سے کم درجے کا سلوک کرتے تھے اور اپنے آپ کو ان سے اعلیٰ و برتر سمجھتے تھے اور ایک عرصہ تک یہ کوشش جاری رہی کہ وہ اسلام کے مادی فوائد سے تمتع نہ کرسکیں جن میں سب سے زیادہ اہم دیوان تھا، جسے عمرؓ نے فتح کا مال عرب جنگ آزماؤں میں تقسیم کرنے کے لئے قائم کیا تھا یا پھر تنخواہ اور پنشن کی وصولی کا معاملہ تھا۔

اس نظام کے مفروضات عرب ور مسلم کا ایک ہونا اور مذہبی وقار کا قیام تھا۔ جس کے ذریعے خلیفہ اپنی حاکمیت کو روبہ عمل لاتا تھا۔ جب یہ جائز نہ رہے تو اس کا ختم ہوجانا ناگزیر ہوگیا۔

۳ نومبر ۶۴۴ء کو خلیفہ عمرؓ کو ایک ایرانی غلام نے شہید کردیا۔ اسلام میں خانہ جنگی کے اندیشہ کو محسوس کرکے انہوں نے بستر مرگ پر ایک شوریٰ یا انتخابی حلقہ قائم کیا جس میں وہ لوگ شامل تھے جو ان کے جانشین بننے کے امیدوار ہوسکتے تھے۔ انہیں یہ ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے آپ میں سے کسی کو خلیفہ چن لیں۔ شوریٰ کی کارروائی کے متعلق تو متناقض اطلاعات ہیں لیکن حیران کن انتخاب عثمان بن عفان کا ہوا۔ عثمانؓ کو لوگ کمزور سمجھتے اور انتہائی نرم دل خیال کیا جاتا تھا۔ جو عربوں کی نظر میں بہت بڑی کمزوری ہے مگر ان کا انتخاب پرانے مکی عدیدی حکمران طبقہ کی فتح تھی جس نے نئے دین کے فوائد اس کے پیغمبر کو تسلیم کرنے کے مقابلہ میں زیادہ جلدی اور مستعدی سے حاصل کئے تھے اور جو سابق سماجی راندۂ قوم لوگوں کو جن کا مدینہ میں اقتدار تھا حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مکیوں کو شریک کرنے کی کوششوں کے باوجود جو ابوبکرؓ اور عمرؓ نے انہیں اعلیٰ عہدوں پر فائز کرکے کی تھیں مثلاً شام کی گورنری کے لئے عمرؓ کا انتخاب معاویہؓ ـــــ وہ غیر مطمئن تھے اور اپنی فضیلت کو جسے وہ اپنا حق سمجھتے تھے بحال کرنا چاہتے تھے۔ معاویہؓ کی طرح عثمانؓ بھی مکہ کے خاندان اُمیہ کے رکن تھے اور حقیقت

یہ ہے کہ وہ پیغمبرؐ کے اولین اصحاب میں مکہ کے امراء کے واحد نمائندے تھے جنہیں اتنا وقار حاصل تھا کہ خلافت کے امیدوار ہو سکتے تھے۔ جب وہ منتخب ہو گئے تو گویا ان کی فتح ہو گئی اور ان کو موقع مل گیا۔ چنانچہ اس موقعہ کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ عثمانؓ جلد ہی مکہ کے مقتدر خاندانوں کے زیر اثر آ گئے اور سلطنت کے اعلیٰ مناصب یکے بعد دیگرے ان کے افراد کو ملنے لگے۔

عرب جنگجوؤں میں عرصہ سے نامعلوم طریقہ پر جو نفرت جڑ پکڑ رہی تھی وہ عثمانؓ کی نرم دلی اور اقربا پروری کی وجہ سے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ مسلم تاریخ ان کے زمانہ کی ابتری کا سبب عثمانؓ کی انتہائی نرمی کو قرار دیتی ہے مگر واقعتاً اس کے اسباب زیادہ گہرے ہیں اور عثمانؓ کا قصور یہ ہے کہ وہ انہیں سمجھنے، ان پر قابو پانے اور انہیں دور کرنے سے قاصر رہے۔ جنگ ہائے فتوحات جو عمرؓ کی وفات تک عرب تاریخ کا خاص مقصد تھیں ان کے انتقال کے بعد رک گئیں۔ عربوں کی ہجرت مکمل ہو چکی تھی۔ عرب عوام باہر نکل کر مفتوحہ صوبوں میں آباد ہو چکے تھے اور حد سے زیادہ آبادی کی قوت محرکہ فی الوقت صرف ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ عربوں کو اب نئی اور زیادہ دشوار رکاوٹوں کا سامنا تھا۔ ایران اور اناطولیہ کے بلند پلیٹو اور وہاں کی غیر ہمدرد اور نادوست آبادیاں جو شمال اور مشرق میں تھیں، اور مغرب میں سمندر تھا۔ لہٰذا جنگ ہائے فتوحات مشکل تر اور رفتار میں سست تر کام بن گئیں۔ اس تعطل نے قبائلیوں کو ان مسائل پر غور کرنے کا موقع دیا جو اب تک خاموش و خوابیدہ تھے۔ اور جلد ہی بدویانہ مرکز گریز طاقتوں نے مل کر نظم و نسق کے انہدام اور عام ابتری کی کیفیت پیدا کر دی۔ مخالف عناصر عمرؓ ہی کے عہد میں نمودار ہو چکے تھے اور ان کی موت کا سبب بن سکتے تھے مگر عثمانؓ جیسے نرم دل حکمران کے زمانہ میں وہ کھل کر سامنے آ گئے۔ ان کے خلاف جو بغاوت ہوئی وہ نہ مذہبی تھی نہ شخصی۔ یہ ہر مرکزی قبضہ و اقتدار کے خلاف بدوؤں کی بغاوت تھی۔ عثمانؓ کی خلافت کے خلاف نہیں بلکہ ہر ریاست کے خلاف تھی۔ ان کا تصور حاکمیت اب تک بدویانہ تھا یعنی ٹھوس اور شخصی۔ جس میں فرمانبرداری رضاکارانہ پیشکش کے طور پر کسی فرد کی کی جاتی تھی۔ چونکہ عثمانؓ اسے پیدا کرنے میں ناکام رہے لہٰذا انہوں نے اسے واپس لے لینے میں اپنے آپ کو آزاد سمجھا اگرچہ عثمانؓ پر مسلح حملہ کرنے والے مصر سے آئے تھے۔ مگر مخالفت کا اصل مرکز مدینہ ہی میں تھا۔

بہرحال ۱۷ جون ۶۵۶ء کو مصر کی عرب فوج کے باغیوں کی ایک جماعت نے جو مدینہ میں اپنی شکایات پیش کرنے کے لئے آئی تھی، خلیفہ کے مکان میں داخل ہو کر انہیں مہلک طور پہ زخمی کیا۔ ان کا قتل تاریخ اسلام کا نقطۂ انقلاب ہے۔ باغی مسلمانوں کے ہاتھوں خلیفہ کے قتل نے ایک الم انگیز مثال قائم کر دی اور خلافت کے مذہبی و اخلاقی وقار کو جو اسلام کا رشتۂ اتحاد سمجھا جاتا تھا بہت زیادہ کمزور کر دیا۔

اس واقعہ کے تقریباً فوراً بعد ہی علیؓ کو خلیفہ چن لیا گیا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ان کو خلیفہ تسلیم کرنے میں تامل کرتے تھے چنانچہ ایک ایسی جماعت تیزی سے تیار ہو گئی جس نے یہ مطالبہ شروع کیا کہ عثمانؓ کے قتل کے مجرموں کو سزا دی جائے۔ علیؓ نے مقتول خلیفہ کے مقرر کردہ بہت سے لوگوں کو ان کے عہدوں سے ہٹا دیا تھا اور اس طرح ان کے مخالفوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ علیؓ کے مخالفین میں حضرت عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ بھی شامل ہو گئے۔ یہ پہلے مکہ گئے اور پھر علیؓ سے لڑنے کے لئے ایک فوج جمع کر کے بصرہ چلے گئے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بصرہ کے لوگ ان کی مدد کریں گے۔

اکتوبر ۶۵۶ء میں علیؓ فوج لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اس واقعہ کی دو اہمیتیں تھیں۔ اوّل یہ کہ اس سے مدینہ اسلامی سلطنت کا مرکز باقی نہیں رہا۔ کیونکہ پھر کوئی خلیفہ وہاں نہیں رہا۔ دوسرے یہ کہ اسلام کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک خلیفہ دوسرے مسلمانوں سے خانہ جنگی کے لئے مسلم فوج کی قیادت کر رہا تھا۔

علیؓ اور ان کی فوج مدینہ سے کوفہ گئی اور غیر جانبدار گورنر ابوموسیٰ سے گفت و شنید کرنے کے بعد وہ اہل شہر کے خیر مقدم کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے۔ یہاں سے وہ بصرہ کی طرف بڑھے اور جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ کی فوجوں کو شکست دی۔ یہ جنگ، جنگ جمل کے نام سے اس لئے مشہور ہے کہ یہ خاص طور پر اس اونٹ کے ارد گرد لڑی گئی جس پر عائشہ امّ المومنین سوار تھیں۔ فتح علیؓ کو نصیب ہوئی طلحہؓ اور زبیرؓ مارے گئے اور عائشہؓ کو مدینہ واپس بھیج دیا گیا۔

بصرہ پر مختصر قبضہ رکھنے کے بعد علیؓ کوفہ واپس آگئے اور یہ ان کا دارالحکومت بن گیا۔ اہل بصرہ نے ان سے موافقت نہ کی۔ اگرچہ علیؓ اب بجز شام ساری اسلامی سلطنت کے مالک تھے مگر ان کی ظاہری قوت کے باوجود قبائلی عدم اتحاد، ان کے حامیوں کی نافرمانی اور مذہبی گروہ کی متضاد و متصادم آراء نے جس

کی تعداد ان کے پیروؤں میں کافی تھی اور جو ان کی حاکمیت پر برابر اعتراض کرتے رہتے تھے اُن کی پوزیشن کو کمزور کر دیا تھا۔ شام میں معاویہ کی پوزیشن بڑی طاقت ور تھی وہ ایک مرکزی اقتدار کے سربراہ تھے جس کے پاس ایک اچھی اور سرحدی جنگوں کی تربیت یافتہ فوج تھی جس نے بازنطینیوں سے بہت سی لڑائیاں لڑی تھیں۔ اخلاقی اعتبار سے بھی وہ بڑی قوت کے مالک تھے ان کے اقتدار و حاکمیت پر کوئی انگشت نمائی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ انہیں عمرؓ نے مقرر کیا تھا۔ اور عثمانؓ نے اس تقرر کی توثیق کی تھی جو آخری متفق علیہ خلیفہ تھے۔ معاویہ کی طرف سے اپنے چچا عثمانؓ کے خون کے انتقام کا مطالبہ عربوں کی قدیم رسم کے مطابق تھا جس پر انہوں نے بہت اصرار کیا۔ علیؓ اور ان کے مخالفین کی ابتدائی لڑائی میں وہ دانشمندی کے ساتھ غیر جانبدار رہے تھے۔ اور اب بھی ان کی طرف سے خلافت کا کوئی دعویٰ پیش نہیں کیا جا رہا تھا۔ بلکہ صرف انتقام کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ ان کا نازک اعتراض یہ تھا کہ علیؓ نے مجرموں کو سزا نہیں دی جس کے لئے وہ اخلاقی طور پر ذمہ دار ہوا اور اس سے بھی ایک نتیجہ ان کی خلافت کے استحقاق پر اعتراض کی صورت میں نکالا گیا تھا۔ اس معاملہ میں ذی رسوخ عمرو اور شام کی متحدہ فوج ان کے ساتھ تھی۔

علیؓ کی خلافت سے ان کی پہلی نافرمانی یہ تھی کہ انہوں نے علیؓ کے نامزد کردہ گورنر کے لئے اپنی جگہ خالی کرنے سے انکار کیا۔ اس حکم عدولی کی وجہ سے علیؓ کو کارروائی کرنا ضروری تھا۔ وہ فوج لے کر مئی ۶۵۷ء میں تباہ شدہ رومن قصبہ صفین کے قریب دریائے فرات کے کنارے شامی فوجوں سے مقابل ہوئے۔ جنگ سے پہلے حسب دستور پہلے گفت و شنید ہوئی۔ مگر بے نتیجہ رہی۔ اس گفت و شنید میں معاویہ نے مطالبہ کیا کہ قاتلان عثمانؓ کو سزا دی جائے اور ان کا استیصال کیا جائے اور غالباً یہ بھی کہ علیؓ خلافت سے دست بردار ہو جائیں۔ اور ایک نئے شوریٰ کا تقرر عمل میں آئے جو نئے خلیفہ کو منتخب کرے۔ بالآخر لڑائی ہوئی اور ۲۶ جولائی کو علیؓ کی فوجیں غالب آ گئیں۔ شامیوں نے اپنی شکست دیکھ کر نیزوں پر قرآن اٹھائے اور یہ نعرے لگانا شروع کئے کہ ہمارے تمہارے درمیان خدا فیصلہ کرے گا۔

نیزوں پر قرآن اٹھانا دشمن کی ایک چال تھی اور علیؓ اس چال کو سمجھ گئے تھے۔ مگر ان کے ساتھیوں نے انہیں عارضی صلح کر لینے پر مجبور کیا۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ ہر فریق اپنا ایک حکم مقرر کرے اور دونوں فریقوں

کے لیڈر اس بات کا عہد کریں کہ وہ فیصلہ کی پابندی کریں گے۔ معاویہ نے اپنا نمائندہ عمرو کو مقرر کیا۔ علیؓ کے پیروؤں نے حکم کے فرائض کے معنیٰ دوسرے دیئے اور علیؓ کو مجبور کیا کہ وہ غیر جانبدار ابو موسیٰ کو اپنی طرف سے مقرر کریں۔ اس تدبیر سے معاویہ کی ایک فتح تو یہ ہوئی کہ اس نے خلیفہ اولی الامر کو خلافت کے جھوٹے مدعی کی سطح پر لا کھڑا کیا۔ پھر تحکیم کی اس کارروائی سے علیؓ کے لئے اور بھی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ ان کے حامیوں کے ایک اہم گروہ نے اس اقدام سے ناراض ہو کر ان سے بغاوت کر دی۔ جسے سخت خونریزی کے بعد فرو کیا گیا۔ یہ لوگ خارجی یا خوارج کے نام سے مشہور ہیں۔ اسلام کی بعد کی تاریخ میں یہ اکثر نمودار ہوتے رہے ہیں۔

جنوری ۶۵۹ء میں دونوں حکم دومۃ الجندل (ADHRUH) میں جمع ہوئے۔ عرب تاریخوں نے ان حالات کو مایوس کن حد تک جانبداری کے ساتھ بیان کیا ہے لیکن یہ بات صاف ہے کہ حکموں کے فیصلے علیؓ کے لئے قطعاً تسلی بخش نہ تھے اور ان میں غالباً ان کی خلافت سے دست برداری شامل تھی۔ علیؓ کے لئے یہ فیصلہ قابل قبول نہ تھا اور صورت حال پھر وہی ہو گئی جو جنگ صفین سے پہلے تھی فرق صرف اتنا ہوا کہ اب علیؓ کی پوزیشن فتنۂ خوارج اور ان کے حامیوں کی انحطاط پذیر حالت کی وجہ سے اور زیادہ کمزور ہو گئی۔ معاویہ مصر کے صوبہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اس کی وجہ سے علیؓ دولت اور سامان رسد کی فراہمی کے ایک بڑے ذریعہ سے محروم ہو گئے۔ معاویہ کھل کر مقابلے میں نہیں آئے۔ مگر پاداش سے بے خوف ہو کر عراق میں لوٹ مار اور چھپ چھپ کر حملے کرنے لگے۔

علیؓ کی زندگی کے آخری سال کے واقعات تاریکی میں ہیں۔ ممکن ہے وہ معاویہ سے صلح کر لیتے یا ممکن ہے نئے حملے کی تیاری کرتے۔ مگر جنوری ۶۶۱ء میں ایک خارجی ابن ملجم نے انہیں قتل کر دیا ان کے بیٹے حسنؓ اپنی طرف سے خلافت کے حصول کی جدوجہد سے دستبردار ہو گئے اور اپنے حقوق معاویہ کو منتقل کر دیئے جو اس وقت شام میں خلیفہ بن چکے تھے اور جلد ہی ساری سلطنت میں عام طور پر تسلیم کر لئے گئے۔